تحریک علی گڑھ کے فنِ سیرت نگاری اور سوانح نگاری پر اثرات

عذرا وقار

علی گڑھ تحریک کے بانی سر سیّد احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) تھے۔ اُن کا تعلیمی پس منظر مذہبی تھا۔ اُنہوں نے قرآن مجید کے بعد فارسی وعربی پڑھی۔ اس کے بعد صرف ونحو، معانی و بیان و بدیع، منطق وفلسفہ، ریاضی، اقلیدس، ہیئت، میں بصیرت پیدا کی۔ فن طب بھی پڑ ... ر چند مہینے مطّب بھی کیا۔ مولوی نوازش علی دہلی کے مشہور عالم و واعظ سے فقہ و اصول پڑھا۔ مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے مقامات حریری وسبعہ پڑھے۔ مولانا مخصوص اللہ سے حدیث پڑھی۔ ۱۸۳۸ء میں سر سیّد کچہری میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۳۹ء میں آگرہ میں نائب منشی ہوئے اور وہیں منصفی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۴۱ء میں منصف مقرر ہوئے اور ۱۸۴۲ء میں فتح پور سیکری آگئے اور وہاں چار برس منصف رہے، فتح پور سیکری سے دہلی تبدیل ہوئے۔ یہاں سے دوبارقائم مقام صدر امین بن کر رہتک بھی رہے۔ ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین مقرر ہو کر دہلی سے بجنور تبدیل ہوگئے[1]۔ بجنور میں سوا دو برس گزارے تھے کہ غدر کا واقعہ ہوگیا۔

برصغیر پاک و ہند میں مغربی تعلیم ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی رواج پا رہی تھی اور جدید علوم وفنون کی تجرباتی و مشاہداتی معلومات جو مسلمانوں کے صدیوں پرانے تصورات سے ٹکرانے اور اُن کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے لگی تھیں۔ چنانچہ قدیم مذہبی عقائد متزلزل ہونے لگے۔ عقلی نقد وجرح، مذہب کے مافوق العقل اور ماورائی حصے کو مشتبہ بنانے لگی۔ انگریز مصنفین اسلام اور حضرت محمدؐ کے خلاف لکھ رہے تھے۔ سر سیّد نے ان حالات میں کہا کہ اس زمانے میں ایک جدید علم الکلام کی حاجت ہے جس سے ہم مغرب کی تنقید کا مقابلہ کر سکیں۔ سر سیّد کے مذہبی افکار نے آگے چل کر مطالعہ قرآن اور عام مذہبی تصورات پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔

سر سیّد احمد خان نے غدر کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کی حالتِ زار کو بہتر بنانے کے بارے میں منصوبہ بندی کی اور اُنہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب تک مسلمان تعلیمی میدان میں آگے نہیں بڑھتے وہ ترقی نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ جب وہ ۱۸۶۸ء میں انگلستان کے دورہ پر گئے تو وہاں اُنہوں نے تعلیمی اداروں کا بغور مطالعہ کیا اور اسکی روشنی میں مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کا پروگرام مرتب کیا۔ انگلستان سے واپس آکر اُنہوں نے اپنا رسالہ ''*تہذیب الاخلاق*'' جاری کیا۔ اس رسالے سے اُردو نثر میں نئے موضوعات آئے اور اسی کی بدولت نئی اُردو نثر کی بنیاد پڑی۔ ۱۸۶۳ء میں سر سیّد نے غازی پور میں ایک

مدرسہ اور ۱۸۶۴ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ جب وہ علی گڑھ آئے تو سوسائٹی کا دفتر بھی وہاں منتقل کر لیا۔ یہ سوسائٹی علوم وفنون کی کتابوں کے اُردو تراجم کرتی۔ مثلاً، الفنسٹن کی تاریخ ہند، اسکاٹ برلن کا علم فلاحت، مَل کی سیاستِ مدن، ٹامسن کا رسالہ آب وہوا، ہیرس کا رسالہ برقی برنارڈ سمتھ کی ریاضی، جہانگیر کی تزک جہانگیری، برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور رولن کی تاریخ مصر مشہور ہیں[۲]۔ علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام معنوی طور پر علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز ہے۔ اُنہوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرسہ العلوم قائم کیا اور ۱۸۷۸ء میں ایم۔اے۔او کالج کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہی کالج ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی بن گیا۔ اس تحریک کے مقاصد تین تھے، مسلمانوں کی تہذیبی بقاء، نئے علوم کی روشنی میں دین فطرت کی توضیع وتشریح اور توہم پرستی کا خاتمہ اور اُردو زبان کا اور اُردو ادب کا فروغ۔ ہمیں یہاں اس کے ادبی خدمات کے پہلو پر اور خصوصاً اُردو نثر کے حوالے سے بات کرنا ہے۔ اس حوالے سے نہ صرف اُردو زبان کو وسعت ملی بلکہ اُردو اسالیب بیان اور روح معانی بھی متاثر ہوئی اور اس کے موضوعات کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ اُس نے لفظ کی داخلی حرکی قوت کو پہنچانا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے اس قوت کو مثبت طور پر استعمال کیا۔ اس سے پیشتر نثری ادب صرف تصوف کے رسائل تک محدود تھا، فورٹ ولیم کالج نے افسانوی نثر کی راہ دریافت کی، دہلی کالج کی فنی اور مرزا غالب کی نجی نثر نے اسے ترقی کا راستہ دکھایا۔ علی گڑھ تحریک نے چونکہ قومی مقاصد کو پروان چڑھانے کا عہد کیا تھا اس کا روئے سخن خواص سے کہیں زیادہ عوام کی طرف تھا اس لئے صرف شاعری اس تحریک کی ضروریات کی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس تحریک نے گہرے تعقل، تدبر، اور شعور کو پروان چڑھانے کا عہد کیا اور اُردو نثر ہی ان مقاصد میں معاونت کر سکتی تھی۔ چنانچہ ادبی سطح پر علی گڑھ تحریک نے اُردو نثر کا ایک باقاعدہ سنجیدہ اور متوازن معیار قائم کیا اور اسے شاعری کے مقفیٰ ومجمع اسلوب سے نجات دلا کر سادگی اور متانت کی کشادہ ڈگر پر ڈال دیا اور یوں ادب کی افادی اور مقصدی حیثیت اُبھر کر سامنے آ گئی۔ علی گڑھ تحریک نے سائنسی نقطۂ نظر اور اظہار کی صداقت کو اہمیت دی اور اسکا سب سے زیادہ اثر سوانح اور سیرت نگاری کی صنف پر پڑا۔ چونکہ سوانح نگاری اور سیرت نگاری کا براہ راست تعلق تاریخ سے ہے اس لئے ہم ان اصناف کو علی گڑھ تحریک کی روشنی میں دیکھیں گے کہ اس تحریک سے ان اصناف پر کیونکر اثرات مرتب ہوئے۔ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری دونوں اصناف میں ہمیں انگریزی ادب کا اثر نظر آتا ہے۔ اس تحریک کے نتیجے میں جو کتابیں تصنیف وتالیف ہوئیں اُن کے نتیجے میں نہ صرف اُردو نثر کو ترقی ہوئی بلکہ مسلمانوں میں جداگانہ قومیت کا احساس بھی پیدا ہوا۔

سرسیّد احمد خان نے اُردو نثر کو نہ صرف ایک نئے موڑ پر ڈالا بلکہ اس میں بیش بہا اضافہ کر کے ترقی کے امکانات پیدا کر دیئے۔ تاریخی ادب میں سرسیّد نے آثار الصنادید لکھی۔ جب یہ پہلی بار ۱۸۴۷ء میں لکھی گئی تو وہ مشکل اور پیچیدا عبارت سے مزین تھی۔ بعد ازاں ۱۸۵۷ء میں اسکا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اسکا انداز سیدھی سادی عبارت کا کر دیا۔ اس میں دہلی کی

عمارات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ سلسلۃ الملوک میں راجگان وشاہانِ دہلی کی تاریخ ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی، تاریخ ضلع بجنور ۱۸۵۷ء، آئین اکبری کی تدوین ۱۸۵۸ء، پہلی اور تیسری جلد، تاریخ سرکش بجنور ۱۸۵۸ء، رسالہ اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۹ء، تحقیق لفظ نصاری ۱۸۵۹ء میں شائع کیا۔ تصحیح تاریخ فیروز شاہی ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی۔ سیرت فریدیہ سرسیّد کے نانا خواجہ فریدالدین وزیر اکبر شاہ کی سوانح عمری ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی۔ الخطبات احمدیہ، سر ولیم مور کی کتاب لائف آف محمدؐ کا جواب (انگریزی) اُردو ترجمہ ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔

سرسیّد مشکل الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے پرہیز کرتے تھے۔ عربی ضرب المثال، قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کا کثرت سے استعمال کرتے، بالعموم چھوٹے فقرے اور پیرے مختصر ہوتے۔ دلائل و براہین سے اپنی رائے کو مضبوط کر کے پیش کرتے۔ اُنہوں نے بہت سے انگریزی مضامین کو کامیابی سے اُردو لباس پہنایا مگر اکثر جگہ انگریزی الفاظ استعمال کئے۔ کہیں کہیں عبارت میں پیچیدہ جملے بھی نکل آتے ہیں سرسیّد خود لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اُردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں کوشش کی۔ مضمون کے ادا کرنے کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا، رنگینی الفاظ سے پرہیز کیا'' [۳]

سرسیّد کے اثرات اُردو نثر پر یہ پڑے، ۱۔ مقصدیت، ۲۔ سادگی، ۳۔ موضوع کے موافق اسلوب بیان۔

سرسیّد ہی نے ادب میں جدیدیت کو راسخ کیا۔ اُنہوں نے تاریخ آثار قدیمہ، تاریخ اور سیرت نگاری کے حوالے سے مجموعی طور پر ایک علمی تصنیفی تحریک کو اُبھارا جس میں آگے چل کر شبلی، حالی، ذکاءاللہ، نزیر احمد، چراغ علی اور پھر سیّد امیر علی نے حصہ لیا۔ علی گڑھ تحریک اُردو کی اولین فکری تحریک تھی، اس تحریک میں زبان کی ظاہری ہیتوں پر توجہ صرف ہوتی تھی۔ اُردو زبان کا قالب ہندوستانی مگر مغز ایرانی تھا۔ اس تحریک نے اُردو کے جسم اور مغز میں رشتہ قائم کیا اور روح اور معنی کو اہمیت دی اور لفظوں کے حسن پر توجہ نہ دی۔ اس کے مولدین نے اُردو ادب کا دامن نثری تحریروں سے بھر دیا اور یہ نثر جدید نثر کے ارتقاء کا سنگ میل ثابت ہوئی۔ نثر چونکہ تبلیغ افکار اور ترسیل علم کا کام دیتی ہے اور اس کے ذریعے سیاسی، سماجی، فکری، علمی اور تہذیبی مقاصد آسانی سے پورے کیے جاسکتے ہیں اور لکھنے والے کو اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت وافادیت ثابت کرنے کے لئے ایسی صنف اور ایسے اسلوب کا سہارا لینا ضروری تھا جو مدلّل، رواں، عام فہم اور اثر انگیز ہو۔ چنانچہ نثر اُردو تاریخی علوم اور فلسفے کے مضامین کے اظہار کے قابل ہوگئی۔ سوانح عمریاں لکھنے کا رواج بھی اُردو میں مغربی اثرات کا مرہون منت ہے۔ ان سوانح عمریوں میں کسی حد تک مناظرانہ اور مدافعانہ انگ پایا جاتا ہے مثلاً خطبات احمد (سرسیّد احمد خان)، بی بی حاجرہ (مولوی چراغ علی) اور (ماریہ قبطیہ)، احیات الاقہ (نذیر احمد)۔ البتہ شبلی نعمانی نے سوانح نگاری میں جارحانہ طرز اختیار کی۔ اُن کی سوانح نگاری اور جذباتی رنگ ہے۔ شرر نے

شخصی جزئیات کو اہمیت دی۔

آثار الصنادید کا نثری نمونہ:

''دہلی میں تعمیرات کا سلسلہ تیرھویں صدی کے ابتدائی حصے میں شروع ہوا اور تین سو برس تک جاری رہا۔ کیونکہ سولھویں صدی کے آغاز میں سکندر لودھی نے آگرہ کو دارالسلطنت بنایا۔ پہلے سو سال ہی میں اس شہر کی مرکزیت اور اہمیت بڑھ گئی کہ کم از کم برصغیر میں تو اسکی مثال نہیں ملتی، اسکا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ دہلی کے لئے لوگ ''حضرت'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اس دور کی تصانیف میں تو بعض وقت صرف ''حضرت'' ہی لکھا ہے۔[۴]

سرسیّد احمد خان نے مغربی خیالات واسالیب کو اخذ کرنے میں نوجوان مسلمانوں کو راغب کیا۔ اُنکی بدولت اُردو اس قابل ہوئی کہ سیاسی اخلاقی اور تاریخی مضامین زور واثر، وسعت وجامعیت، سادگی اور صفائی کے ادا کر سکتی۔

اسباب بغاوت ہند کا نثری نمونہ:

''غصہ ایک ایسی چیز ہے کہ معاملات کو آنکھ سے چھپا دیتا ہے۔ طبیعت انتقام اور سیاست کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ سچ ہے کہ جو وارداتیں ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں پیش آئیں اس لائق تھیں کہ ہمارے حکام کو جس قدر غصہ آوے اور جس قدر انتقام اور سیاست کریں بجا ہے۔ مگر ہندوستان کے حالات پر غور کرنا چاہئے کہ در حقیقت کس قدر سرکشی ہندوستان میں اصلی تھی اور کیوں اس قدر بڑھ گئی اور کیوں اس قدر دکھائی دی اور بد نصیب مسلمان کیوں زیادہ مفسد بعض اضلاع میں دکھائی دیئے''[۵]۔

علی گڑھ تحریک کے تحت سرسیّد نے روایت کی تقلید ترک کے کے آزاد خیالی، عقل، نیچر اور مادی ترقی اور جدید تہذیب کو بڑی اہمیت دی۔ اُردو میں تاریخ نگاری کے بارے میں اُنکی پختہ رائے تھی کہ تاریخ قومی ترقی اور اصلاح کے لئے مفید ہے اور اس نقطۂ نظر سے تاریخ نگاری کرنی چاہئے علاوہ ازیں وہ افراد سے زیادہ اجتماعی مسائل کو اہمیت دیتے۔ سرسیّد کے ہم خیال ادبا کی تحریروں میں سرسیّد کے مکتب فکر کے واضح اثرات ملتے ہیں، انہیں اثرات کے اجتماعی عمل کو علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے[۶]۔

الطاف حسین حالی

سوانح نگاری کو اُردو میں دوام بخشنے کے بانی ہیں۔ حالی کے سامنے مغرب کی سوانح عمریوں کے نمونے موجود تھے۔ اُنہوں نے سرسیّد کی سوانح عمری حیات جاوید لکھی، حیات جاوید کو اس لحاظ سے حالی کے اسلوب کا شاہکار کہا جاسکتا ہے کہ اس

میں اُنہوں نے سرسیّد کے عملی دنیا کے علاوہ سرسیّد کے علمی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اُن کی تحریر کی سادگی، اُن کی عبارت میدانوں میں بہنے والے کسی نرم سیر دریا کی طرح ہے کہ اس راستے کی سب منزلوں کو یک رنگ ہمواری کے ساتھ طے کرتا جاتا ہے اور سطح پر معمولی شکن بھی پیدا نہیں ہوتے ۷۔ حالی سوانح نگاری میں ہو بہو مصوری کے مغربی اصول سے بے خبر لگتے تھے۔ سوانح نگاری میں کچھ ثابت نہیں کیا جاتا بلکہ یہ تو سراپا کچھ ہونے کا نام ہے مگر حالی سرسیّد کو ہر طرح سے سچا ثابت کرنے پر تلے نظر آتے ہیں اسی باعث اُن کے ایک ساتھی شبلی نے اُن پر وکالت کرنے اور مدلّل مداحی کرنے کا الزام لگایا۔ بلکہ حالی کی تصنیفات، سیرت حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید تینوں ہی پر یہ اعتراض ہے کہ یہ مولانا نے اُنکی سیرت نہیں لکھی بلکہ اُنکو پیرمان کران کے کارنامے بیان کئے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کی سوانح لکھنے کے قائل تھے جو دعوت عمل دیتی ہیں۔

حیات جاوید

حیات جاوید میں بیانیہ نگاری کا اسلوب ہے۔ موضوع پر بات کم اور مصنف کی اپنی رائے کا حصہ زیادہ ہے جو ایک تبصرے کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اُن کے بیان میں خیال کی رنگ آمیزی، تشبیوں اور تمثیلوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قیاس تمثیلی حالی کا خاص حربہ ہے۔ اُن کے ذہن کو مماثلتوں کے اظہار میں اور اُنکو اپنی منطق کے تابع بنانے کیلئے اس خاص طریقے سے بڑا اُنس ہے جس کا استعمال اُنہوں نے حیات جاوید سے زیادہ حیات شبلی اور یادگار غالب میں کیا۔ حالی کی نثر میں آہنگ کی ایک عجیب شان ہے۔ یعنی پیراگراف میں ایک دعویٰ اور باقی فقرے اسکی دلیل ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کے اسلوب میں پُرشکوہ روانی ہے۔ ایک جوئے شیر ہے جو چلتی رہتی ہے، بہتی رہتی ہے کبھی نہیں رکتی۔ حیات سعدی کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> ''زمانہ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترھویں صدی سے بائیوگرافی کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ کی طرح بائیوگرافی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ حال کی بائیوگرافی میں اکثر مؤرخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کئے جاتے ہیں۔ مصنف کے کلام پر غور وغوص کیا جاتا ہے اور اس کے عیوب اور خوبیاں صاف طور پر بیان ظاہر کی جاتی ہیں۔

حیات سعدی

شیخ سعدی کے حالات زندگی پر حالی کی اُردو میں یہ تصنیف سیرت پر پہلی کتاب ہے حالی نے سعدی کی تصانیف سے حالات زندگی جمع کئے ہیں۔ شیراز، سعدی کے وطن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے انسان کے قویٰ میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے جاتے ہیں۔۔۔ خصوصاً شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پایہ تخت رہا ہے مسلمان

ایرانیوں نے جس طرح قم کو 'دارالمومنین'، اور یزد کو 'دارالعباد' کا خطاب دیا ہے اسی طرح شیراز کو 'دارالعلوم' کے لقب سے مُلقب کیا ہے۔

''جس زمانے میں شیخ (سعدی) نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا اگرچہ اس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر ظاہری شان وشوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی''[۸]۔

یادگار غالب:

حالی کے خیال میں اُنہوں نے اس میں ایک ایسی زندگی کا حال بیان کیا ہے جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہ ہماری پس ماندہ سوسائٹی کے لئے کچھ کم نہیں، حالی، غالب، کی ظرافت اور زندہ دلی سے قوم کی شپرمردگی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں۔

''وہ اس خیال سے کہ اُن کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے، اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ اس بات کی اُنہوں نے فارسی اور اُردو نظم ونثر میں جا بجا شکایت کی''۔

حیات جاوید: اس دیباچے میں لکھتے ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اسکی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کریٹکل طریقے سے لکھی جائے۔ اسکی خوبیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی دکھائی جائیں۔ آگے لکھتے ہیں۔ سرسیّد کی لائف میں جیسا کہ اُنکے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے بہت سی ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن پر اُن کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر سیّد علی بلگرامی نے تمدن عرب، ڈاکٹر گستاولی بان کی فرانسیسی زبان کی کتاب کا اُردو ترجمہ کیا اور تمدن ہند جو اُسی مصنف کی فرانسیسی تصنیف تھی کا ترجمہ ہے۔ اُنہوں نے تمدن عرب کا جو کہ موسیو سدیو کی کتاب تھی فرانسیسی میں کتاب تھی کا اُردو ترجمہ کیا۔ نمونہ:

تمدن عرب:

ہارون الرشید جس کے زمانہ کی تصویر ہمیں الف لیلہ میں نظر آئی ہے (۷۸۶ء۔۸۰۹ء) اور اُس کے بیٹے مامون کا وہ زمانہ (۸۱۳ء۔۸۳۳ء) جس میں بغداد نے اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی اور سرسبزی حاصل کی اور مشرق کے تمام شہروں میں سب سے نامآور بن گیا۔

تمدن ہند:

ہند کے تعلقات یونانیوں کے ساتھ بلخ کی یونانی حکومتوں کے ذریعے سے مدت تک باقی رہے، جیسا کہ میگیتھنز کی سفارت سے ثابت ہوتا ہے۔اس یونانی سفیر کوسلوکس نیکوٹارشم کے حاکم نے تقریباً تین سو سال قبل مسیح پاٹلی تپر کو بھیجا تھا[9]۔

مولانا محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں یہ بھی گویا سوانحی خاکے ہیں

نمونہ:

آبِ حیات: میر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جب تک لکھنؤ آباد رہا، جب کسی اور شہر میں جانے کا ذکر ہوتا تو دونوں صاحب ہی فرماتے تھے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اسکی قدر کیا جانے گا اور ہماری زبان کے لطف کو کیا سمجھے گا''[10]۔

دربارِ اکبری میں مختلف حالات مختلف ذرائع سے جمع کر کے لکھے۔

دربارِ اکبری:

اکبر بادشاہ قوم کا ترک، مذہب کا مسلمان تھا۔ رعیت یہاں کے ہندی وطن اور ہندو مذہب تھے اتفاق اور اختلاف کے مقدمے تو ہزاروں تھے مگر میں ان میں سے ایک نکتہ لکھتا ہوں۔۔۔

غرض رات نے صبح کی کروٹ لی، ستارہ نے آنکھ ماری اور شفق خونی پیالہ بھر کے مشرق سے نمودار ہوئی۔نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جا کر بہ آواز بلند چلایا کہ سنو، بے خبرو، کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہنچے، اور دریا بھی اُتر لیئے۔اس وقت خان زمان کے کان کھڑے ہوئے۔مگر جاناں کہ آصف خان کی چالاکی ہے۔مجنوں خان قاقشال کو پھونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا، مگر پرواہ نہ کی[11]۔

مولانا آزاد کے اسلوب میں دلی کی عام بول چال کا برجستہ اور محاورانہ استعمال نظر آتا ہے۔وہ ایک مصور کی طرح الفاظ کے رنگ وروغن سے جیتے جاگتے مرقعے تیار کرتے ہیں۔

شبلی نعمانی

شبلی نعمانی نے سوانح نگاری کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی میں بھی کمال پیدا کیا اُنہوں نے نہ صرف سرسیّد کی علی گڑھ میں موجود لائبریری سے استفادہ کیا بلکہ بلادِ اسلامیہ کا سفر کر کے روم، شام، مصر، عرب اور ایران کے بڑے بڑے کتب خانے

چھان مارے، اور اپنی سوانح عمریوں کے لئے مستند مواد حاصل کیا۔ اُنہوں نے مذہب، تاریخ اور فلسفے میں باہمی ربط پیدا کیا۔ اس سلسلے میں ان کی تصانیف *المامون*، *امام غزالی*، *سیرت النبیؐ*، *الفاروق*، *سیرت نعمانی* اور *مولانا روم* ہیں۔ شبلی اسلام کے شیدائی تھے، اسی لئے ان کی بہترین تصنیف *سیرت النبیؐ* کو مانا جاتا ہے جو وہ اپنی حیات میں مکمل نہ کر سکے اور بعد ازاں ان کے شاگرد سیّد سلمان ندوی نے اس ادھورے کام کو مکمل کیا۔ شبلی نے کارلائل، گبن، رینکی اور بکل کے فلسفہء تاریخ سے استفادہ کیا[۱۲]۔

شبلی اسلامی تاریخ کے مطالعے اور مغربی مورخین کے افکار، پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تاریخ چیدہ چیدہ واقعات کا بیان ہی نہیں انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقاء کی داستان بھی ہے۔ شبلی کے خیال میں مورّخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہئے کہ وہ ہر حال میں غیر جانبدار رہے۔ وہ حقائق کا ادراک کر کے اور ان کی روشنی میں نتائج کا استنباط کرے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلامی تہذیب کا عہد ماضی انسانی تمدن کا ایک درخشاں باب تھا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں شبلی کا تصورِ تاریخ سرسیّد سے مختلف ہو جاتا تھا کہ وہ آگے کو دیکھتے تھے اور شبلی ماضی سے طاقت حاصل کرنے کے قائل تھے۔

سیرت نگاری میں بھی شبلی کا انداز ایک مورّخ کا سا ہے۔ وہ سوانح عمریوں کو پھیلا کر تاریخ بنا دیتے ہیں اور وہ صاحب سیرت کے عہد کی ایک جامع تاریخ بن جاتی ہے۔ واقعات کی صداقت اور سچائی پر زور دیتے ہیں مگر وہ بالعموم ایسے بزرگ اشخاص کی سیرت لکھتے ہیں جن کی بشری کمزوریوں کا تذکرہ نہ کرنا بھی قابل ملامت نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود وہ اپنی مؤلفہ سیرت کی کتابوں میں فطرت انسانی کی جھلکیاں دکھانے میں کامیاب ہیں۔ شبلی کے نزدیک سیرت کی کتابوں کا واضح مقصد ہونا چاہئے۔ وہ اس مقصد کو اصلاح اخلاق اور تربیت سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ تحقیق اور سند کے ساتھ اپنی بات کو پیش کرتے ہیں

نمونہ اورنگ زیب:

اورنگ زیب اور ہندوؤں کی عام ناراضگی کے اسباب:۔

عالمگیر کے جرائم میں سے بڑا جرم بلکہ مجموعہ جرائم ہے۔ عالمگیر نے ہندوؤں کو ملازمت سے یک قلم برطرف کر دیا۔ ان کے مذہبی میلے ٹھیلے موقوف کرا دیئے۔ ان کی درسگاہیں بند کرا دیں۔ ان پر جزیہ لگایا۔ ان کے بت خانے تڑوا دیئے۔ غرض اس حد تک اُنکو ستایا کہ وہ زبان حال سے بول اُٹھے۔

آں قدر جور کن کہ اگر جائے
گفتہ اید کس اعتماد کند[۱۳]

المامون کے دیباچے میں سرسیّد لکھتے ہیں:۔

اُردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان، طرز بیان

جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز، گو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے۔۔۔ شبلی نے اسکا بہت خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اسکو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی صحیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی حالت پر موجود ہے[۱۴]۔

المامون سے نمونہ:۔

خلفائے راشدین کے بعد مسلمانوں میں شخصی حکومت شروع ہوگئی۔ جس کی بنیاد امیر معاویہ نے ڈالی تھی۔ اُس وقت سے آج تک جہاں جہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی شخصی اختیارات کے اصول پر ہوئی جس کا ایک لازمی خاصہ یہ تھا کہ فرمانروائے وقت کسی عام ملکی قانون کا پابند نہیں ہوتا ہے[۱۵]۔

الفاروق سے نمونہ:

عرب قوم کو ایک خصوصیت خاص حاصل تھی۔ عرب میں بعض خاص خاص باتیں ایسی پائی جاتی تھیں جن کو تاریخی سلسلے سے تعلق تھا اور جو اور قوموں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً انساب کا چرچا جس کی کیفیت یہ تھی کہ بچہ بچہ اپنے آباؤ اجداد کے نام اور اُن کے رشتے ناتے دس دس بارہ بارہ پشتوں تک محفوظ رکھتا تھا۔ اس بنا پر عرب میں سب سے پہلے تاریخی تصنیفات وجود میں آئیں[۱۶]۔

شبلی کے خیال میں یورپ کے مقابلے میں ہند میں لکھی گئی تاریخ اُن مقاصد کے لئے ناکافی تھی جو تحریک علی گڑھ کے تھے۔ سرسیّد تاریخ نگاری میں نہ صرف دلچسپی لیتے تھے بلکہ اُن کو اس سے متعلق نظریاتی آشنائی بھی تھی۔ وہ تاریخی واقعات کے ساتھ اُن کے اسباب بھی ڈھونڈتے تھے۔ شبلی نے اس فن کو کمال تک پہنچا دیا اور تاریخ نویسی میں ادیبانہ شان کا اضافہ کیا۔ وہ سر سیّد کی طرح تاریخی واقعات کے انساب کے ساتھ ساتھ سماجی، ثقافتی، علمی اور ذہنی ارتقاء کا حال بھی بیان کرتے۔ *المامون* کے دیباچے میں اُنہوں نے قدیم مشرقی واقعہ نگاری اور جدید مغربی تاریخ نویسی کا فرق تفصیل سے بیان کیا ہے۔

سیرت النبیؐ جیسی ضخیم کتاب جسکی دو جلدیں شبلی لکھ چکے تو اُن کی وفات ہوگئی۔ اُس کے بعد اُن کے شاگرد نے اسکی باقی جلدیں لکھیں۔ سیّد سلمان ندوی نے بھی اُنے اُستاد کے زیرِ سایہ تاریخ نویسی کا فن سیکھا تھا۔

سیّد سلمان ندوی کی کتاب 'خیام' سے نمونہ:

شہر نیشاپور کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حنفی، شافعی، اشعری و معتزلی کی جنگ برپا تھی۔۔۔ پھر ایسی حالت میں کہ علماء و فقہاء کی عزت و حرمت،

سلطانی درباروں میں تھی انکی جاہ پرستی، حرص وطمع، رشک وحسد اور مناظروں کے افسانے امام غزالی کی احیاء العلوم باب المناظرہ میں دیکھو جو اس عہد کے چشم دید گواہ ہیں اور جسکی بنا پر وہ دربار واہل دربار سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہوکر گوشہ نشین ہو گئے تھے[۱۷]۔

مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق کا تعلق سرسیّد تحریک سے تھا۔ اُنہوں نے اُردو نثر کو آگے بڑھانے میں بڑا اہم کام کیا۔ وہ حالی کے سچے جان نشین تھے اُنہوں نے چند ہم عصر میں سوانحی خاکے لکھے ہیں۔ نمونہ:

سرسیّد کے بارے میں ''اس برعظیم کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، ذی علم وفضل، پاک نفس بزرگ اور مصلح گذرے ہیں لیکن ان کا دائرہ ایک یا دو مہمات تک محدود تھا۔ لیکن سرسیّد کا میدان عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔

علامہ اقبال کے بارے بارے میں لکھتے ہیں:

میں اپنی زندگی میں سینکڑوں اشخاص سے ملا ہوں اور ملتا رہا ہوں ان میں عالم فاضل بھی ہیں، ادیب شاعر بھی ہیں، صاحب ثروت بھی ہیں، اور مفکر ومجتہد بھی۔ لیکن ایسے دو چار ہی ملے جن میں انسانیت بھی ہے اور یہ وہ شے ہے جو بہت کم یاب ہے۔ اس خوبی کی وجہ سے میرے دل میں ڈاکٹر محمد اقبال کی بیحد قدر ہے[۱۸]۔

فورٹ ولیم کالج کی نثر نے داستان گوئی کی جو روایت ڈالی تو نثر کا اگلا پڑاؤ مقصدیت ٹھہرا، تحریک علی گڑھ کا سب سے نمایاں پہلو مقصدیت تھا۔ وہ ادب وشاعری میں بھی مقصدیت کی قائل تھی۔ یہ دور نثر کا دور تھا اور علی گڑھ سے متاثر بڑے بڑے نثار اس دور میں پیدا ہوئے۔ مذہب، فلسفہ اور ادب وسائنس کے علاوہ ان لوگوں نے سوانحی نگاری اور تاریخ نویسی میں نام پیدا کیا۔ تاریخ میں مستند مواد اور دلیل یہ دو ہتھیار تھے جس سے سرسیّد اور اُن رفقاء کام لیتے تھے۔ یہ تمام لوگ براہ راست یا بالواسطہ انگریزی تاریخ نگاری اور سوانحی نگاری سے متاثر ہوئے۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں شعراء کے سوانحی خاکے لکھے۔ مولانا حالی نے سوانحی کتابیں لکھیں جن میں سرسیّد اقبال اور سعدی شامل ہیں۔ اُن کی تحریر کی خصوصیت سادگی اور دردِ دل تھیں۔ شبلی تاریخ نویسی کے سلسلے میں پس منظر کو بیان کرنے پر زور رکھتے تھے کہ کسی بھی واقعہ کے پیچھے محرکات کیا تھے۔

دراصل اگر دیکھا جائے تو اُردو کا تمام قدیم نثری ادب ایک طرح سے سوانحی ہے۔ چونکہ اُردو نثر کی اولین تحریریں صوفیائے کرام کی تحریروں یا پھر خود ان کے تذکرے، ملفوظات، منقولات اور سوانح پر مشتمل تھیں اور ایک طرح سے تاریخی اہمیت کی حامل تھیں۔ اس لئے اُردو میں تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کی بنیاد تو تھی مگر تحریک علی گڑھ نے نہ صرف اسکو وقت کے تقاضوں

سے ہم آہنگ کیا، مغربی اصولوں کو خود پر لاگو کیا بلکہ اُردو نثر جو اس سے بیشتر بہت مشکل اور مقفیٰ و مسجع طریقہ پر لکھی جاتی تھی، اُسے بھی ان دشوار گذار راہوں سے نکال کر آسان اور رواں بنا دیا اور عام لوگوں کی پہنچ کے قابل بنا دیا۔ جس سے عام لوگوں میں اپنی تاریخ اور اپنے ہیروز کے بارے میں ایک فخر پیدا ہوا اور اسی سے آگے چل کر مسلم قومیت کی بنا پڑی۔

حوالہ جات

۱۔ حامد حسن قادری، *داستانِ تاریخ اُردو*، کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۶۶ء، ص ص ۲۹۴۔۲۹۷۔

۲۔ ڈاکٹر انور سدید، *اُردو ادب کی تحریکیں*، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۸۵ء، ص ۳۱۹۔

۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، مدیران، سیّد فیاض محمود، ڈاکٹر عبادت بریلوی، نویں جلد، *اُردو ادب* (جلد چہارم)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء، ص ۸۵، ۸۷۔

۴۔ سر سیّد احمد خان، *آثار الصنادید*، کراچی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۶ء، مقدمہ۔

۵۔ ایضاً، *اسبابِ بغاوتِ ہند*، لاہور، مطبوعہ مصطفائے پریس، ت، ن، ص ۴۸۔

۶۔ دائرۃ معارف اسلامیہ، ۲/۱۴ : ۱۵۷۔

۷۔ مولانا الطاف حسین حالی، *حیاتِ جاوید*، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء، تعارف از سیّد عبداللہ۔

۸۔ عبداللطیف اعظمی، شبلی کا مرتبہ *اُردو ادب* میں، کراچی، صفیہ اکیڈیمی، ۱۹۶۷ء ص ۷۸۔

۹۔ حامد حسن قادری، بحوالہ سابقہ، ص ص ۶۴۴۔۷۱۷۔

۱۰۔ مولانا محمد حسین آزاد، *آبِ حیات*، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۴۳۲۔

۱۱۔ حامد حسن قادری، بحوالہ سابقہ، ص ۴۹۸۔

۱۲۔ سیّد سلطان محمود حسین، *اُردو کی نثری تاریخ میں سر سیّد کا مقام*، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۷۱ء، ص ۹۸۔

۱۳۔ شبلی نعمانی، *اورنگ زیب عالمگیر*، لاہور، مقبول اکیڈمی، ت، ن، ص ۳۵۔

۱۴۔ ایضاً، *الماموں*، دہلی، افضل المطابع پریس، ت، ن، دیباچہ۔

۱۵۔ ایضاً، بحوالہ سابقہ، ص ۳۔

۱۶۔ شبلی نعمانی، *الفاروق*، کانپور، نامی پریس، ۱۸۹۸ء، ص ۳۔

۱۷۔ سیّد سلمان ندوی، *خیام: اُسکی سوانح و تصانیف*، اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۷۹ء ص ۷۹۔

۱۸۔ مولوی عبدالحق، *چند ہم عصر*، کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۸۴ء، ص ۳۵۲، ۳۵۴۔

کتابیات

۱۔ مولانا محمد حسین آزاد، *آبِ حیات*، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۹۱ء۔

۲۔ انور سدید، *اُردو ادب کی تحریکیں*، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۸۵ء۔

۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، مدیر فیاض محمود، چودھویں جلد، علاقائی ادب (دوم)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء۔

۴۔ مولانا الطاف حسین حالی *حیات جاوید*، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء۔

۵۔ دائرۃ معارف اسلامیہ، جلد۔

۶۔ سید سلطان محمود حسین، *اُردو کی نثری تاریخ میں سر سیّد کا مقام*، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۷۱ء۔

۷۔ سر سیّد احمد خان، *آثار الصنادید*، کراچی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۶ء۔

۸۔ ایضاً، *اسبابِ بغاوت ہند*، لاہور، مصطفائے پریس، ت،ن۔

۹۔ شبلی نعمانی، *الفاروق*، کانپور، نامی پریس، ۱۸۹۸ء۔

۱۰۔ ایضاً، *المامون*، دہلی، افضل المطابع پریس، ت،ن۔

۱۱۔ ایضاً، *اورنگ زیب*، لاہور، مقبول اکیڈمی، ت،ن۔

۱۲۔ عبداللطیف اعظمی، *شبلی کا مرتبہ اُردو ادب میں*، کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء۔

۱۳۔ حامد حسن قادری، *داستان تاریخ اُردو*، کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۶۶ء۔

۱۴۔ مولوی عبدالحق، *چند ہم عصر*، کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۸۴ء۔

۱۵۔ سیّد سلمان ندوی، *خیام: اُس کی سوانح و تصانیف*، اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۷۹ء۔